مولانا حذیفہ وستانوی جامعہ اکل کوا

فلاح وکامرانی کی خشت اول

ذکر خیر چھوڑ دینے والے بلند ہمت لوگ اور انسانوں کی اعلیٰ ترین قسم میں شامل ہونے کا طریقہ

واذکر عبادنا إبراهيم و إسحاق و يعقوب أولي الأيدي و الأبصار إنا أخلصناهم بخالصة ذكرى الدار.

اللہ رب العزت کا جتنا بھی ہم شکر ادا کریں کم ہے کہ اللہ رب العزت نے ہمیں ایمان اور علم کی دولت سے خاص طور پر علم دین کی دولت سے مالا مال کیا، اچھے انسان کی ہمیشہ یہ آرزو اور تمنا ہوا کرتی ہے، کہ وہ دنیا میں کوئی ایسا کام کر جائے کہ جس کے کرنے سے یہاں سے چلے جانے کے بعد اور اس کی موت کے بعد بھی دنیا اسے یاد کرتی رہے، اور یہ تمنا اور آرزو کوئی غلط چیز نہیں ہے، کیوں کہ جب قرآن کریم نے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کارناموں کا تذکرہ کیا تو ان کے کارناموں کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ نے ان کے ساتھ ایک انعام اور ایک وعدہ یہ بھی کیا کہ ہم آپ کے بعد آپ کا ذکر خیر چھوڑیں گے، کہ دنیا میں لوگ آپ کو بھلائی سے یاد کرتے رہیں گے۔ اب ظاہر سی بات ہے کہ اس دنیا میں انسانوں کی بڑی تعداد ہے؛ ہر زمانہ میں انسان پیدا ہوتے رہے۔ اب یہ لازم اور ضروری نہیں ہے کہ ہر آدمی ایسا کام کر جائے کہ جس کے کرنے سے اس کا ذکر خیر اس دنیا میں رائج اور عام ہو، البتہ حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک، ہر زمانہ میں سنت اللہ یہ رہی کہ بہر حال کچھ لوگ ضرور ایسے ہوا کرتے ہیں جو انتہائی عظیم کارناموں کو انجام دینے کی وجہ سے اپنی زندگی میں بھی یاد کئے جاتے ہیں اور اپنے مرنے کے بعد بھی، وہ اپنے پیچھے ذکر خیر چھوڑ جاتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ آخر انسان دنیا میں اپنا ذکر خیر چھوڑنے کے لیے کون سی صورت اپنائے، کون سا طریقہ اختیار کرے، جس کی بنا پر اللہ رب العزت بھی اس کے لیے یہ فیصلہ کر دے کہ اس کے مرنے کے بعد قیامت تک اس کا ذکر خیر ہوتا رہے، تو اس سلسلہ میں قرآن پاک ہماری بھر پور رہنمائی کرتا ہے۔ چناں چہ قرآن کریم ہمیں وہ اوصاف وکمالات بتاتا ہے، جن کی بنا پر آج بھی لاکھوں کروڑوں برس پہلے گذرے ہوئے انسانوں کے تذکرے زندہ ہی نہیں بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔

جو آیت کریمہ اوپر پیش کی گئی اس کی تفسیر میں امام ابن القیم الجوزیؒ جو بڑی جاندار اور شاندار کتابوں کے مصنف گذرے ہیں، جو ابن تیمیہؒ کے تلمیذ تھے، فرماتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے فرمایا: واذکر عبادنا إبراهيم واسحاق و يعقوب أولى الأيدى و الأبصار. "واذکر" اور یاد کیجئے "عبادنا" ہمارے بندوں میں سے "إبراهيم واسحاق و يعقوب" کو جو دو اہم صفات کے حامل تھے: ایک یہ کہ وہ صاحب علم وبصیرت تھے اور دوسرے یہ کہ وہ بلند ہمتی اور جواں مردی سے متصف تھے۔

ابن القیم الجوزیؒ فرماتے ہیں کہ قرآن ان الفاظ کے ذریعہ یہ بیان کرنا چاہتا ہے کہ انسان میں اگر یہ دو وصف پائے جائیں تو انسان ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر پہنچ سکتا ہے، وہ ایسے کارناموں کو انجام دے سکتا ہے، کہ جن کارناموں کی وجہ سے اللہ رب العزت دنیا اور آخرت میں اس کے لیے سرخ روئی مقدر فرما دیتے ہیں۔ بہر حال ان قدسی صفات بزرگوں کی پہلی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ صاحب علم وبصیرت تھے؛ لہٰذا انسان میں پہلی چیز علم اور بصیرت کا ہونا ضروری ہے، تاکہ وہ حق اور باطل، خیر وشر، حلال اور حرام، جائز وناجائز میں تمیز کر سکے، اور اسے یہ معلوم ہو جاوے کہ یہ چیز حق ہے اور یہ چیز باطل، یہ چیز خیر ہے اور یہ چیز شر، یہ چیز مفید ہے یہ چیز مضر، اس چیز کا دنیا اور آخرت میں یہ فائدہ ہو سکتا ہے، اور اس چیز کا دنیا اور آخرت میں یہ نقصان۔ "والأبصار" سے اسی کی طرف اشارہ ہے۔

اور دوسری صفت کی طرف "اولی الایدی" سے اشارہ ہے، فرمایا کہ وہ قوت، طاقت، بلند فکری اور بلند ہمتی کے مالک تھے، جس کو عربی زبان میں "علو الهمة" کہا جاتا ہے۔

مطلب یہ کہ ایک آدمی کو حق اور باطل کا علم ہے، وہ حق اور باطل اور شر اور خیر میں تمیز کرتا ہے، اس کے انجام بد اور انجام خیر کو جانتا ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ اس میں ایسی ہمت اور طاقت کا ہونا ضروری ہے، کہ جس ہمت اور طاقت کے بل بوتے پر کیسے ہی برے حالات اُس پر آجائے وہ حق کو حق جان کر حق کو نافذ کرنے کی کوشش کرے گا۔ آج مسلمانوں کو بالخصوص علماء ومدارس کے طلباء کو اس چیز کی نہایت ضرورت ہے، کہ وہ سستی اور غفلت کا شکار نہ ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کی کامیابی کا راز اللہ رب العزت نے بیان کیا، حضرت یعقوب کی کامیابی کا راز اللہ نے بیان کیا حضرت اسحٰق کی کامیابی کا راز بیان کیا کہ یہ لوگ وہ تھے جو الابصار یعنی دین، حلال و حرام اور حق وباطل بارے میں کی خوب اچھی طرح معرفت رکھتے تھے، اور انبیاء تھے، کیسے ان کو معرفت نہیں ہو سکتی تھی، تو دوسری طرف ان میں یہ صفت تھی کہ وہ حق کو نافذ کرنے کے لیے کیسے بھی قربانی کیوں نہ ہو، اس کے لیے وہ تیار تھے یعنی وہ بلند ہمتی کے حامل تھے، تو معلوم ہوا کہ انسان کے اندر دو اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔

انسانوں کی چار قسمیں:

امام ابن القیم الجوزیؒ فرماتے ہیں حق اور باطل کو جاننے اور حق کو باطل پر ترجیح دینے کے اعتبار سے انسان کی

کل چار قسمیں ہیں:

(۱) سب سے پہلی قسم تو وہ ہے کہ ہر زمانہ میں کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو حق اور باطل کو خوب جانتے ہیں، ان کو اس کا علم ہوتا ہے، اور ان کے اندر وہ جرأت اور طاقت بھی ہوتی ہے، کہ وہ کسی بھی صورت میں حق کو نافذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں؛ چاہے اس کے لیے اپنا مال کھپانا پڑے، یا اپنی عزت کو قربان کرنا پڑے، خواہ اس کے لیے اپنی دولت کی قربانی دینی پڑے، یا اپنے اولاد کی۔ غرضیکہ اپنی کسی بھی محبوب سے محبوب چیز کو قربان کرنا پڑے، وہ حق بیانی اور حق کی ترویج وتنفید کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں، تو یہ ہے انسانوں کی سب سے اعلیٰ ترین جماعت۔

(۲) دوسری وہ جماعت ہوتی ہے، جو اس کے برعکس، نہ تو اسے حق کا علم ہوتا ہے، نہ اسے یہ علم ہوتا ہے کہ یہ حق ہے اور یہ باطل، اور نہ تو اسے یہ پتہ ہوتا ہے کہ یہ خیر ہے اور یہ شر، اور نہ اسے یہ پتہ ہوتا ہے کہ یہ اچھا ہے اور یہ برا ، اسے کوئی علم نہیں ہوتا بلکہ وہ جاہل ہوتا ہے، اور نہ اس کے پاس بلند ہمتی ہوتی ہے، جب وہ حق کو جانتا ہی نہیں تو وہ حق کو نافذ کرنے کی کوشش کیسے کر پائے گا، یہ انسانوں کی سب سے کمتر وارذل ترین جماعت ہے۔ اللہ ہماری حفاظت فرمائے۔ یہ وہ لوگ ہے کہ اللہ رب العزت کے یہاں ان کی کوئی عزت نہیں، چاہے وہ کتنے ہی حسین اور جمیل کیوں نہ ہو، چاہے کتنے ہی مال کے مالک، کتنی ہی دولت اور کتنی ہی عزت اور کتنی ہی ڈگریاں اپنے پاس رکھتے ہوں، مگر یہ دو چیزیں ان کے پاس نہ ہونے کی وجہ سے، وہ عنداللہ سب سے ارذل ترین جماعت ہوتی ہے۔

(۳) اس کے بعد فرمایا تیسری قسم انسانوں کی وہ ہوتی ہے، جو حق اور باطل کا علم رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے اور یہ باطل، مگر ان کے اندر حق اور باطل کو نافذ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی، جس کو ''المؤمن الضعیف'' کہا جائے، تو یہ اس کے لیے صحیح تعبیر ہے، وہ ڈرتا رہتا ہے وہ اپنے اندر جرأت نہیں رکھتا، یہ آدمی بھی ٹھیک ہے، مگر بہت زیادہ ٹھیک نہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہے کہ ''المؤمن القوی خیر من المؤمن الضعیف''.

امام ابن القیم الجوزیؒ نے بڑا جاندار استدلال فرمایا، وہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا، قوی مومن' ضعیف مومن سے اچھا ہے۔ تو قوت سے یہاں جسمانی قوت مراد نہیں ہے، ہمارے طلبہ جسمانی ورزش پر توجہ دیتے ہیں، اس کو سب کچھ سمجھتے ہیں، یہاں وہ ورزش والی طاقت مراد نہیں ہے، بعض طلبہ تو اس کیلئے مدرسہ کی چیزیں بلا اجازت استعمال کرتے ہیں۔ ظاہری بات ہے وہ قوت بھی حاصل ہو تو کوئی کام کی نہیں، کیوں؟ اس لیے کہ آپ نے جس طریقہ سے قوت حاصل کرنے کی کوشش کی وہ ناجائز طریقہ ہے، آپ کو مدرسہ نے سیمنٹ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی، آپ کو مدرسہ نے سلیے (Rods) کے استعمال کی اجازت نہیں دی، تو ظاہر بات اس سے جو قوت حاصل ہو اس قوت کا بھی کوئی فائدہ نہیں، ایسی قوت سے کچھ ہوتا نہیں، اللہ کے یہاں ایسی قوت کا کوئی خیال اور لحاظ نہیں، اللہ ایسی قوت کو پسند نہیں کرتا۔

بہر حال یہ بات بیچ میں آگئی، کہنے کا مطلب یہ کہ ہمیں المؤمن القوی بننے کی کوشش کرنا چاہئے یعنی حق اور باطل کو جاننے کے بعد ہر حالت میں حق کو بیان کرنا، حق کو نافذ کرنا ہمارا فریضہ ہونا چاہئے۔

(۴) چوتھی قسم انسانوں کی یہ ہوتی ہے کہ وہ طاقت اور ہمت بہت رکھتے ہیں، مگر انہیں حق اور باطل کا علم ہی نہیں، کہ کیا حق ہے اور کیا باطل۔ فرمایا اس میں اور دوسری قسم میں کوئی فرق نہیں، اس لیے کہ وہ اپنی طاقت کو استعمال کرے گا باطل کے لیے، اور اس کو یہ پتہ ہی نہیں کہ میں حق کے لیے استعمال کر رہا ہوں یا باطل کے لیے۔

اب ہمیں سوچنا چاہئے کہ ہمارا شمار کس جماعت میں ہے، ہم اللہ سے دعا کریں کہ اللہ رب العزت ہمیں آیت کریمہ: اولی الأیدی والأبصار کے مطابق علم وبصیرت اور نفاذ حق کی صلاحیت دے کر پہلی جماعت میں شامل فرمالے۔ آمین!

پہلی جماعت میں شامل ہونے کا طریقہ:

ابن القیم الجوزیؒ قرآن اور حدیث کو گھول کر پی گئے تھے، اسی لیے آگے اس کا بھی طریقہ بیان فرماتے ہیں، یہ جو کچھ وہ بیان کر رہے تھے، ایسا لگتا ہے کہ درحقیقت ان کی زبان نہیں بول رہی ہے بلکہ قرآن وحدیث کا نور بول رہا ہے۔ بہر حال ان کے بقول کسی بھی چیز کو حاصل کرنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے: (۱) ارادہ (۲) علم۔ جب ارادہ ہوگا تو آدمی علم کی طرف جائے گا اور جب علم حاصل ہو جائے تو اب کوشش یہ ہونی چاہئے کہ اس میں مہارت ورسوخ پیدا ہو۔ فرماتے ہے کہ علم میں مہارت اس وقت پیدا ہوگی، جب کہ آدمی طلب علم کے زمانہ میں ہمت سے کام لے، وہ راتوں کو جاگنے سے پیچھے نہ ہٹے، وہ بھوکا رہنے سے گھبرائے نہیں، وہ آنے والے مصائب کے لیے تیار رہے، لیکن اپنے مقصد میں لگا رہے، دنیا کی تاریخ آپ اٹھا کر دیکھئے، ابھی عرب ممالک اور یورپین ممالک میں ھندسة الحیلة و صناعة التأثیر کے عنوان سے مستقل کتابیں لکھی جارہی ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے اندر صلاحیتیں کس طرح پیدا کرے، اپنی ذات کو کس طرح نکھارے اور کس طرح بلند مقام تک پہنچنے کی کوشش کرے، اور اس کے لیے کون سا طریقہ اختیار کرے؛ اس سلسلہ میں عرب علماء کی کتابیں زیادہ معتبر ہے؛ اس لیے کہ وہ قرآن وحدیث کی روشنی میں لکھ رہے ہیں؛ مثال کے طور پر مشہور عربی عالم ''علی الحمادی'' ہے، ان کی اس عنوان پر بڑی جاندار تصنیف ''مھندسو الحیاۃ و صناع التأثیر .. من ھم؟ کے نام سے ہے، انہوں نے اپنی اس کتاب میں اس بات کا تذکرہ کیا ہے؛ فرمایا کہ انسان اپنے اندر بلند ہمتی کیسے پیدا کرے؟ اس وقت دنیا میں انسان بہت ساری غلط فہمیوں کا شکار ہے، سب سے بڑی غلط فہمی یہ ہے، کہ انسان کی ایک بڑی جماعت' یہ سمجھ بیٹھی ہے، دنیا کے اندر عزت اور مقام اسی کو حاصل ہوتا ہے، جس کے پاس پیسہ ہو؛ کہا کہ یہ غلط ہے۔ ہم نے ایسے انسانوں کے بارے میں تو تاریخ میں پڑھا ہے، جن کے پاس ایک روپیہ نہیں تھا، مگر ان کو ایسی عزت ملی، کہ بعد کے لوگ اس مقام تک پہنچنے سے قاصر رہے، باوجو

داسباب وسائل ہونے کے۔

مثلاً خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کا حال تو ہم جانتے ہی ہیں، کون مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فقیرانہ وزاہدانہ زندگی سے ناواقف ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فقر فقرِ اختیاری تھا، اللہ نے تو فرمایا تھا، کہ اے میرے حبیب اگر آپ چاہیں تو پہاڑوں کو ہم سونا بنادیں، بعض احادیث میں اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إنی أخاف علی أمتی المال. میں اپنے امت پر مال سے ڈرتا ہوں۔ لا أخاف الفقر مجھے فقر سے ڈر نہیں۔ فقر رہے گا تو یہ اچھے سے رہیں گے، لیکن مال آئے گا تو یہ طغیانی اور سرکشی پر اتر آئیں گے۔ آج امت ان ہی حالات سے دو چار ہے؛ امت کے پاس مال ہے، دولت ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ طغیانی، بے دینی اور لادینیت۔ اس طرح کی چیزیں ایسی عام ہو چکی ہیں، کہ جس کا اندازہ ہم نہیں لگا سکتے۔ تو بہر حال وہ فرماتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے کہ بہت سارے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ڈگریاں ہوں تو انسان کو بہت اونچا مقام ملتا ہے، حالاں کہ ہم نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے کہ جن کے پاس کوئی ڈگری نہیں پھر بھی اللہ رب العزت نے ان کو عزت سے سرفراز کیا۔

اور بہت سارے لوگ یہ سمجھتے ہے کہ انسان حسین اور جمیل ہو انسان ذرا مضبوط اور قوی ہو، اس صورت میں اس کو عزت حاصل ہوتی ہے۔ فرمایا انسان کو عزت حاصل کرنے کے لیے، حسن وجمال کی بھی ضرورت نہیں، انسان کو عزت حاصل کرنے کے لیے، کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں، انسان کو عزت حاصل کرنے کے لیے سب سے اہم ضرورت ہے کہ اخلاص وللہیت کے ساتھ اللہ کے علاوہ کسی سے نہ ڈرتے ہوئے، تن' من' دھن کی بازی لگادے۔

پھر آپ نے عجیب وغریب مثال بیان فرمائی' حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں سے بہت سارے صحابہ کو آپ دیکھیں گے، کہ وہ جسمانی طور پر بڑے عیب دار، مگر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں ان کا بڑا اونچا مقام تھا۔ حضرت بلال حبشیؓ کو ہی لے لیجئے، آپ بالکل سیاہ تھے، مگر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی قربانیوں کی وجہ سے مؤذن بنادیا، کیسی ہمت تھی حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی، ان کو گرم بالو کے اوپر اونٹ سے گھسیٹا جاتا تھا اور پوچھا جاتا تھا کہ بلال بتاؤ کہ تمہارا رب کون ہے؟ وہ فرماتے ''احد' احد'' اللہ ایک ہے ایک ہے۔ میرا رب اللہ ہی ہوسکتا ہے اور کوئی میرا رب نہیں ہوسکتا، یہاں تک کہ ان کو انگاروں پر ڈالا جاتا تھا، آپ نے صبر سے کام لیا، تو اسی صبر نے حضرت بلال کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مؤذن بنادیا، صرف اتنا ہی نہیں، اللہ کے نزدیک ان کا مقام دیکھیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہے کہ جب میں جنت میں گیا، تو بلال آگے چل رہے تھے، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوچھا کہ اے بلال! کس چیز نے تمہیں یہاں تک پہنچادیا؟ کہا کہ میں تحیۃ الوضوا ور تحیۃ المسجد کا التزام کرتا ہوں، اور ہم لوگ زندگی میں کبھی نہیں پڑھتے، یہ حضرت بلال کی سنت ہے سنت بلالی ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اسی چیز نے تم کو آگے کردیا، انسان جتنا زیادہ نفل عبادتیں کرتا ہے، اتنا زیادہ اللہ کا مقرب بنتا ہے، اللہ کا تقرب اسے حاصل ہوتا

ہے، ان کو یہ عزت اور بلندی کہاں سے ملی؟ مال سے یا ڈگری سے یا حسن و جمال سے؟!!

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے مؤذن حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ ہیں آپ بھی ضریر البصر تھے، نابینا تھے، ان کو دکھائی نہیں دیتا تھا، مگر ان کی بلند ہمتی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے، کہ حضرات صحابہؓ فرماتے ہیں، قادسیہ کے موقع پر جب ہم لوگ جہاد کے لیے مدینہ سے نکلنے لگے، تو عبداللہ بن ام مکتومؓ ہمارے پاس آئے، اور کہنے لگے کہ مجھے بھی ساتھ لے لو، ہم نے کہا کہ آپ نابینا ہیں، آپ کیا کریں گے؟ کہا کہ میں ایک کام کر سکتا ہوں، تم کو میدان میں اسلامی جھنڈے کو پکڑنے کے لیے ایک آدمی چاہئے اور اس کے لیے ایسا آدمی ہونا چاہئے جو بھاگے نہیں، مجھے دکھائی نہیں دیتا، میں بھاگ نہیں سکتا ہوں، لہٰذا میں جھنڈا لے کر کھڑا ہو جاؤں گا اور اس جھنڈے کو پکڑ کر رہوں گا، چاہے میری جان چلی جائے، لیکن میں بھاگنے والا تو ہوں نہیں۔ ہم نے ان کو سمجھایا، لیکن وہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوئے، یہاں تک میدان قادسیہ میں ہمارے ساتھ تشریف لے گئے اور بڑی بلند ہمتی کے ساتھ یہ خدمت انجام دی، اس جنگ میں کافروں کی تعداد مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔

ایک صحابیؓ کے بارے میں آتا ہے وہ بھی نابینا تھے، ان کو کسی نے بتایا کہ ایک یہودی عورت ہے، جو مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو برا بھلا کہتی ہے، ان کی غیرت نے گوارا نہیں کیا، انہوں نے کہا کہ میں اپنے ہاتھ سے اس کو قتل کروں گا۔ صحابہؓ نے کہا کہ اے اللہ کے بندے تم کو دکھائی نہیں دیتا، تو پھر بھی کہا کہ میں اس کو قتل کروں گا، صحابہ بھی حیران کہ یہ آدمی کیسے کہتا ہے؟ تو ایک رات اس کے گھر میں داخل ہو گئے، اور اس عورت کو قتل کر دیا اور صحیح سلامت باہر آئے، صحابہ حیران تھے پوچھا کہ آپ کیسے گئے کہا کہ میں دیوار کو ٹٹولتے ٹٹولتے پہنچا، جب میں پہنچا تو بچے رونے لگے تو وہ عورت دوڑتے ہوئے پاس آ گئی میں سمجھ گیا کہ یہ ہی وہ عورت ہے، میں نے اس پر حملہ کیا، بعد میں تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ اسی عورت کو قتل کیا، یہ ہے بلند ہمتی۔ جب آدمی کوئی کام کے کرنے کی ٹھان لیتا ہے، تو کوئی چیز اس کے لیے مانع نہیں ہوتی، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ طالب علم اپنے لئے ایک نقطہ کو متعین کر لے، کہ مجھ کو محدث بننا ہے، مجھے فقیہ بننا ہے، مجھے عالم بننا ہے، مجھے امام بننا ہے، مجھے پیشوا بننا ہے، تو پھر اس کو سامنے رکھ کر وہ محنت کرے؛ ضرور بضرور وہ اپنے مقصد تک پہنچے گا۔

آپ نے امام عطا بن ابی رباحؒ کا نام سنا ہوگا، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ انسانوں میں جتنے عیب ہو سکتے ہیں، وہ تمام عیوب ان کے اندر پائے جاتے تھے۔ بال گھنگریالے تھے، چہرا سیاہ تھا، ناک چپٹی تھی، ایک ہاتھ ان کا شل ہو گیا تھا، پاؤں سے لنگڑے تھے، لیکن فرماتے ہیں کہ حضرات صحابہؓ کے بعد مکہ مکرمہ کے سب سے بڑے فقیہ تھے، و کان افقہ الناس بمکۃ و کان أعلم الناس بالمناسک فرماتے ہیں کہ اسلامی تاریخ میں حج کے احکام کو سب سے زیادہ جاننے والا اگر کوئی ہے تو وہ عطا بن ابی رباح ہیں۔ حالاں کہ جتنے عیوب انسان میں ہو سکتے ہیں، وہ ان میں تھے۔

ہم اور آپ جانتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کتنے جلیل القدر صحابی ہیں، جن کے بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أعلمهم بالحلال و الحرام. میری امت میں حلال اور حرام کا سب سے زیادہ جاننے والا معاذ بن جبل ہے۔ ۱۹ سال کی عمر ہے، ۱۹ سال کی عمر میں ایسی زبردست فقاہت تھی کہ حضور نے ان کی فقاہت کا اعتراف کیا، اور حضور کے ہوتے ہوئے ان کو فتوی دینے کی اجازت حاصل تھی، لیکن ان کے بارے میں آتا ہے: و کان اعرج. کہ آپ پاؤں سے لنگڑے تھے۔ حضرت عمر بن خطابؓ فرمایا کرتے تھے، میرے بعد اگر معاذ بن جبل زندہ رہے تو میں ان ہی کو خلیفہ بناؤں گا؛ لیکن طاعون عمواس میں حضرت عمرؓ کی زندگی ہی میں وہ شہید ہو گئے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ بڑے جلیل القدر صحابی ہونے کے علاوہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے: من دهاة العرب یعنی عرب کے انتہائی فطین اور ذہین لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تین لوگوں کو دهاة العرب کہا جاتا تھا۔ معاویہ بن ابی سفیان، مغیرہ بن شعبہ، اور عمرو بن العاص۔ حالانکہ مغیرہ ابن شعبہ کے بارے میں آتا ہے: و کان اعور آپ کان سے بہرے تھے

احنف بن قیس کے بارے میں آتا ہے کہ اتنے عیوب ان کے اندر پائے جاتے تھے، ایک تو ٹھگنے تھے، ان کا منہ عجیب وغریب تھا، ان کے دانت اوپر تھے، ان کی تھوڑی بالکل ٹیڑھی تھی، وہ آنکھ سے اعور تھے، مگر و کان ابین الناس ، انسانی تاریخ میں ان سے بہترین خطاب کرنے والا کوئی پیدا نہیں ہوا۔ آپ حضرت انس بن مالک کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ احنف بن قیس ایک آواز لگا دے، تو ایک لاکھ انسان اپنی تلواروں کو نیام سے باہر نکال دیں؛ ایسے صاحب اللسان تھے، تو جسمانی طور پر معیوب ہونا، ان کی کامیابی میں رکاوٹ نہیں بن سکا۔

اندلس کو فتح کرنے والے، طارق بن زیاد کے آقا موسی بن نصیر، ان کے بارے میں آتا ہے کہ جس وقت وہ طارق بن زیاد کے ساتھ وہاں پہنچے اس وقت ان کی عمر ۸۰ رسال کی تھی، اور انہوں نے وہاں کھڑے ہو کر کہا میں نے ۴۰ سال کی عمر سے لے کر آج ۸۰ رسال کی عمر تک، ایک بار بھی شکست نہیں کھائی اور نہ کبھی مجھے شکست کا خیال گذرا، اس کے بعد بھی وہ ۱۳ رسال زندہ رہے؛ فرماتے ہیں کہ ۵۳ رسال تک آپ اسلامی فوج کے سپہ سالار رہے، مگر اس ۵۳ رسالہ زندگی میں ایک مرتبہ بھی اسلامی لشکر کو شکست نہیں ہوئی، ۹۳ رسال کی عمر تک لڑتے رہے، اس کے علاوہ اور بھی بے شمار مثالیں آپ کو تاریخ میں مل جائیں گی۔

بہت دور جانے کی ضرورت نہیں، ابھی کی بات ہے شیخ یٰسین نامی فلسطین کے بہت بڑے عالم ہیں ان کو چار پانچ سال پہلے شہید کیا گیا، وہ سب سے پہلے فلسطین میں تحریک انتفاضہ لے کر کھڑے ہوئے، کہ فلسطین کو آزاد کرو، ہم بیت المقدس میں آزادانہ نماز پڑھنا چاہتے ہیں، حالاں کہ وہ دونوں پاؤں سے معذور تھے، دونوں ہاتھ شل تھے، وہ صرف اپنی گردن ہلا سکتے تھے، اس کے علاوہ ان کا بدن نہیں ہلتا تھا، میں نے خود آپ کی تصویروں کو دیکھا ہے کہ پورا بدن آپ کا شل تھا، صرف آپ کی گردن حرکت کرتی تھی، اس کے علاوہ دوسری کوئی چیز حرکت نہیں کرتی تھی، لیکن اس سب کے باوجود

فلسطین کی بہت بڑی اسلامی یونیورسٹی ''جامعۃ الغزا'' کے نام سے آپ نے قائم کی؛ مزید براں ۵۰ کے قریب دواخانے تعمیر کروائیں اوراس کے علاوہ ایک بہت بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ فلسطینی عوام کو یہودیوں کے خلاف جہاد پر آمادہ کردیا، اسکے لیے مستقل ایک تنظیم ''حرکتہ الحماس'' کی بنیاد رکھی، یہ انسان کی ہمت ہے جو اسے کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔

مزید برآں علم کے میدان میں بھی ہمارے علماء نے کیسی قربانیاں دیں، حاکم جو المستدرک کے مصنف ہیں، جنہوں نے المستدرک علی الصحیحین کتاب لکھی، اس میں ایسی حدیثوں کو جمع کیا جو امام مسلم اور بخاری کے شرائط کے مطابق تھیں، یعنی امام بخاری نے جب اپنی کتاب کو لکھا تو چند شرائط متعین کیے، کہ میں اپنی کتاب میں ایسی ایسی حدیثوں کو بیان کروں گا، لیکن بہت ساری حدیث ان کے کتاب میں نہیں آسکیں، چھوٹ گئیں، امام مسلم نے بھی یہی طریقہ اپنایا، تو وہ فرماتے ہیں کہ میں نے پوری دنیا میں گھوم گھوم کر علم حدیث کو حاصل کیا اور ۹۰ سال کی عمر ہوئی، تو کہا کہ مجھے ایسی کتاب لکھنی ہے، جس میں بخاری اور مسلم میں چھوٹی ہوئی تمام حدیثیں آجائیں، جو شرائط میں ان ہی حدیثوں کے مطابق ہوں، تو المستدرک علی الصحیحین کے نام سے انہوں نے تقریباً ۱۵ رجلدوں میں اپنی زندگی کے ۹۰ ربہاروں کے گذرنے کے بعد، جب ۹۱ رسال میں قدم رکھا تب لکھنا شروع کیا اور ۲ رسال میں اس تصنیف کو مکمل کیا۔

امام صادق الرافعیؒ یہ عربی زبان کے بہت بڑے ادیب گذرے ہیں۔ ۱۵۔۲۰ سال پہلے ان کا انتقال ہوا، ''وحی القلم'' کے نام سے چار جلدوں پر مشتمل ایک کتاب ہے، جس میں انہوں نے ان اعتراضات کے تشفی بخش جوابات دیئے ہیں جو مستشرقین اور اسلامی دشمنوں کی طرف سے قرآن کریم اور احادیث رسول پر وارد ہوتے ہیں۔ حالاں کہ ان کے بارے میں آتا ہے، وکان أصم آپ کان سے بہرے تھے۔ تو معلوم ہوا کسی کا بہرا ہونا، کسی کا اندھا ہونا، کسی کا لنگڑا اور لولا ہونا، کسی کا بدصورت ہونا، انسان کو بلند مقام تک پہنچنے سے مانع نہیں بنتا، لیکن کب؟ جب انسان اپنے ہدف کو متعین کرنے کے بعد اس کے لیے مکمل کوشاں ہوجائے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے بہت سارے ایسے تلامذہ ہیں جو آپؓ کے ساتھ تیس تیس سال تک رہے؛ امام ابو یوسفؒ کے بارے میں آپ بارہا سن چکے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ آپ ۱۷ سال تک رہے، اور بعض روایتوں میں ۲۰ سال تک رہے، اور کبھی بھی آپ کی ایک نماز تکبیر اولیٰ کے ساتھ فوت نہیں ہوئی، کیوں کہ ہر نماز کے بعد امام صاحبؒ کا درس ہوتا تھا، آپ برابر درس میں حاضر ہوتے تھے، تو درس میں حاضر ہونا، محنت کرنا، بلند ہمتی کا اپنے آپ کو حامل بنانا، سستی اور غفلت کو پس پشت ڈالنا؛ یہ وہ چیزیں ہیں جو انسان کو بلند مقام تک پہنچا دیتی ہے۔

عبداللہ بن محمد، عراقؒ کے فقیہ ہیں جنہوں نے کتاب المغنی جو ۲۰ رجلدوں پر مشتمل ہیں' کا ۲۳ مرتبہ مطالعہ کیا۔ نعیم المجمر، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں ۲۰ سال تک رہے۔ عبداللہ بن نافع، امام مالک کی

خدمت میں ۳۵ سال رہے۔ ثعلبہ فرماتے ہیں کہ میں نے ۵۰ سال تک اپنے استاذ ابراہیم حربی کی کوئی نحو وصرف کی مجلس نہیں چھوڑی۔ ابوزرعہؒ فرماتے ہیں کہ میرے استاذ امام احمد لاکھوں حدیثوں کے حافظ تھے۔ مکحولؒ فرماتے ہیں کہ میں نے طلب علم کے لیے پوری روئے زمین کی خاک چھان ڈالی۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں میں نے ایک لاکھ اساتذہ سے حدیثیں لیں اور ہر ہر استاذ سے دس دس ہزار۔

بلند ہمتی......اللہ کی مدد کا محور!!!

لیکن اس قید خانہ سے رہائی پانے کے لئے انسان کو بلند ہمتی سے رہنا پڑے گا۔ اللہ تعالی بلند ہمتی کو پسند فرماتے ہیں، بلند ہمت انسان کے ساتھ اللہ کی مدد ہوتی ہے بلکہ خود اللہ تعالی بلند ہمت مرد مومن کے ساتھ ہوتے ہیں۔

God helps those who help themselves (خدا اسکی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں)

جب انسان بلند ہمتی کا مظاہرہ کرتا ہے تو پھر بدر میں مٹھی بھر جماعت مسلح لشکر جرار کو خاک آلود کر دیا کرتی ہے، سینکڑوں من وزنی دروازہ ایک نیزہ کی نوک سے اکھڑ جایا کرتا ہے، نعرۂ تکبیر کو گونج سے قیصر وکسری کے بلند و بالا قلعے زمین بوس ہو جایا کرتے ہیں۔ جب مرد مجاہد اللہ کی مدد کے ساتھ اٹھتا ہے تو دریاؤں اور طوفانی موجوں کو راستہ دینا پڑتا ہے۔ میرے آقا ﷺ کے سپاہیوں کے لئے درندوں کو بھی جنگل خالی کرنا پڑا۔ حضرت شرجیلؓ ایک دبلے پتلے صحابی ہیں۔ ایک جنگ کے موقع پر ایک قلعہ کئی دن سے فتح نہیں ہو رہا تھا۔ ایک دن اس مرد قلندر کا یہ جذبہ ایمانی جوش میں آتا ہے، اپنا گھوڑا دوڑا کر اکیلے اس قلعہ کے پاس جاتے ہیں اور تین مرتبہ بلند آواز سے نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہیں اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر! پورے کا پورا قلعہ زمین بوس ہو جاتا ہے۔ یہ قلبی جمعیت تھی، تعلق باللہ تھا، قوت باللہ تھا، قوت ایمانی تھی کہ قوی ہیکل اور ناقابل تسخیر قلعہ بھی مجاہد کے نعرۂ تکبیر کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ جی ہاں ایسا ہوتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ بندہ کی طرف قوت ایمانی کے ساتھ ساتھ ہمت وعزم وارادہ اور محنت بھی ہو۔ (ماہنامہ راہ عافیت جلد نمبر: ۷ ص ۳۶)

لہٰذا ہمارے طلبہ غفلت کا، سستی کا اور پست ہمتی کا شکار نہ بنے انسان جب اپنے لئے کوئی ہدف کو متعین کرلیوے کہ مجھے فلاں مقام تک پہنچنا ہے، فلاں کام کو کرنا ہے، تو و من یتق اللّٰہ یجعل لہ مخرجًا کے مطابق آپ کے لیے وعدہ ہے، آپ بھی اپنا ہدف متعین کر لیجئے، کہ مجھے ادیب بننا ہے، مجھے محدث بننا ہے، مجھے فقیہ بننا ہے، اور پھر اسی اعتبار سے آپ تیاری کو شروع کر دیجئے، دیکھو اللہ رب العزت آپ کے علم میں کیسی برکتیں عطا فرماتے ہیں۔

اخیر میں اللہ رب العزت سے ہم دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں بھی ایسی ہمت عطا فرمائے جیسی ان لوگوں کو عطا کی گئی تھی، اور اللہ رب العزت ہمیں علم نافع کی دولت سے مالا مال فرما کر دنیا اور آخرت میں ہمارے ذکر خیر کو باقی رکھنے کا فیصلہ فرمائے اور ہم سے راضی ہو جائے۔ آمین!